بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کی نئی "زیارت گاہیں"

(پرویز)

سر خاک شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہال ملت ما سازگار آمد

2 اکتوبر 1965ء کی شام' جبکہ سورج کی' خون شفق میں ڈوبی ہوئی کرنیں' واہگہ کے لالہ زار کو الوداعی سلام کہہ کر رخصت ہو رہی تھیں' میں' چند احباب کی معیت میں باٹا پور فیکٹری سے باہر' نہر کے کنارے کھڑا تھا۔ سامنے' نہر کے پل کی شکستہ سلیں پانی میں سرنگوں تھیں اور پانی این و آں سے بے پرواہ' نہایت خاموشی سے آگے بڑھے جا رہا تھا۔ اسے اس کا بھی علم و احساس نہیں تھا کہ وہ کس طرح پاکستان کی تاریخ کے ایک نئے باب کا عنوان بن چکا ہے۔۔۔ اشیائے فطرت کی کیفیت ہی یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات انسانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیتی ہیں لیکن اس کا (Credit) خود نہیں لیتیں۔ ان کے برعکس یہ حضرت انسان ہے جس کی حالت یہ ہے کہ **یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا** (3:187)۔ یہ ان کاموں کے لئے بھی اپنی تعریف چاہتا ہے جنہیں اس نے سرانجام نہیں دیا ہوتا۔۔۔ میں اس نہر کے کنارے خاموش کھڑا تھا اور میرے پردۂ تصور پر ماضی کے نقوش ایک رنگین فلم کی طرح ابھرتے چلے آرہے تھے۔۔۔ اکثر ایسا ہوا کہ اتوار کے دن' درس کے بعد ہم نہر باری دوآب کے کنارے

کنارے' سیدھے واہگہ کی سرحد تک چلے گئے۔ راستہ میں یہ بڑی نہر(لنک کینال) بھی پڑتی تھی۔ اس وقت یہ بات کبھی حیطہ تصور میں بھی نہیں آئی تھی کہ یہ نہر جسے ہم محض حسن مناظر کی جوالا نگاہ سمجھ رہے ہیں' ایک دن پاکستان کا باب السلام۔ ہماری ہر متاع حیات کی محافظ و پاسبان۔ سرزمین لاہور کے لئے حصن حصین' اور جسد ملت کی رگ حیات بن جائے گی۔ پھر' میرے سامنے 14 اگست کی دوپہر کا وہ منظر بھی تھا جب واہگہ کی سرحد پر' رن اوف کچھ کے ہنگامہ کے بعد' ہندوستان اور پاکستان کے قیدیوں کے جادلہ کی ایک غیر رسمی لیکن نہایت موثر اور عبرت آگیں تقریب منعقد ہوئی تھی اور جب ہمارے ایک قیدی کے بدلہ میں' ہماری طرف سے ہندوستان کے سات قیدی چھوڑے جاتے تھے تو اس وقت ہمارے دلوں میں پاکستان کی عظمت و برتری کا احساس کس قدر گرم جوشی پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے کسٹم کالونی کی حسین اور مصفا عمارت تھی۔ جہاں مشروبات سے ہماری نہایت بے تکلفانہ تواضع ہوئی تھی۔ پھر میرے سامنے وہ منظر آیا جب' 6 ستمبر سے ایک ہی ہفتہ پہلے' ہم ستلج رینجرز کے کمانڈر' میجر علیم کی دعوت پر' شام کے وقت جھنڈے اتارنے کی خاموش اور پروقار تقریب دیکھنے کے لئے سرحد کے پھاٹک تک گئے تھے۔۔۔ خلوص اور محبت کا پیکر میجر علیم ایک باغ و بہار شخصیت! واپسی پر رات ہو گئی تو جلو موڑ کی دو رویہ دوکانیں' جہاں پہلے آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا' جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

یہ سب کچھ میری نگاہوں کو دامان باغبان و کف گل فروش بنا رہا تھا کہ یکایک اس فلم کا دوسرا سین سامنے آگیا۔ نہر کے اس پار' جلو موڑ کی ساری آبادی ویرانے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تاحد نگاہ ہولناک خاموشی اور قبرستان کا سا سکوت تھا۔ انسان تو ایک طرف' کوئی چرند و پرند بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ حسین' شاداب کسٹم کالونی ویران ہو چکی تھی۔

--- --- نہر سے اس طرف چند قدموں تک' لیکن اس پار' دور دور تک کھنڈرات

ہی کھنڈرات دکھائی دے رہے تھے۔۔ میجر علیم اور ان کے ساتھیوں کے متعلق مختلف قیاسات تھے۔ انہوں نے جس جانبازانہ ہمت اور مجاہدانہ شجاعت سے' بھارتی فوج کے اچانک شبخون کو تنہا روکا تھا' اس کے متعلق پختہ خبریں وجہ نشاط روح ہو رہی تھیں۔

لیکن اس کے بعد ان پر کیا گذری' اس کے متعلق کوئی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔۔۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ حیات جاوداں کی ہزار عشرت سامانیاں اپنے جلو میں لئے فی جنت و نھر ○ فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر ○ (54:55)- شادکام و کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔۔۔ وہ جہاں بھی ہیں' خدائے ذوالمنن کے سحاب کرم کی لا انتہا بارشیں ان پر گہرباری کریں۔

میں انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ کھٹ کھٹ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ہمارے مورچوں کے قریب' ایک جوان رعنا' میجر کی پرشکوہ وردی میں ملبوس' کڑی کمان کے تیر کی طرح آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ چہرہ نہایت شگفتہ و شاداب۔ ایسے افسردہ و پژمردہ ماحول میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے صحرا میں لالہ کا پھول کھلا ہو۔ پاس سے گذرا تو ہمارے ساتھ کھڑے میجر۔۔۔ کو دوستانہ سلام کرتا آگے بڑھ گیا۔ لیکن چند قدم جانے کے بعد لوٹا اور آکر ہم سب سے نہایت محبت اور خلوص سے ملا۔ کہا کہ معاف فرمایئے! سامنے جھاڑی کی ایک جنبش نے میری توجہ کو اس قدر جذب کر رکھا تھا کہ میں رک نہ سکا۔ اب اطمینان کے بعد واپس آیا ہوں۔ باتیں تو چند ہی کیں لیکن انہی سے اس کا حسن سیرت اور بلندئ کردار آئینے کی طرح سامنے آگیا۔۔ اقبال کے تصور کا ایک جیتا جاگتا مرقع کہ

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

اتنے میں مجھے نہر کے اس پار' کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ یہ تین سکھ سپاہی تھے جو ریت کی خود ساختہ دیوار کے پیچھے بھارت کے ترنگے جھنڈے کو سنبھالے کھڑے تھے۔ میں نے میجر صاحب سے پوچھا کہ یہ اتنے قریب ہیں' کبھی کوئی بدتمیزی تو نہیں کرتے۔ میں نے دیکھا کہ یہ سن کر اس جیالے سپاہی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔۔۔ کہنے لگا۔ پرویز صاحب! آپ بدتمیزی کہتے ہیں؟ اگر یہ کبھی ہماری طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھیں تو خدا کی قسم یہیں کھڑے کھڑے ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ یہ مفتوح علاقہ پر اپنا جھنڈا گاڑے کھڑے ہیں۔ اس احساس سے سپاہی کا سر آسمان کو چھو جانا چاہئے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہے کہ وہ کس قدر افسردہ و پژمردہ کھڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کسی نے شیر کے سامنے بکری باندھ رکھی ہو۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ محض فائر بندی کی ڈھال ہے جس کے پیچھے انہیں سانس لینے کی مہلت مل گئی ہے۔ ورنہ زندگی ان کے نصیب میں کہاں؟۔۔۔ وہ یہ کہہ رہے تھے اور مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کہیں ابھی بندوق کی لبلبی نہ دبا دیں۔

اتنے میں میرے احباب نے کہا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ ہم نے رخصت چاہی تو اس ایریا کے کمانڈر نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ چائے کا پیالہ پئے بغیر کیسے واپس جا سکتے ہیں۔ ہم نے ہزار معذرت چاہی لیکن سپاہی کے آگے کس کی پیش جا سکتی ہے؟ باٹا کمپنی کے اندر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ وہاں زبردستی لے گئے۔ دروازے کے باہر' ایک مگرمچھ نما بم پڑا تھا۔ کہنے لگے' اس سے ذرا ہٹ کر آئیے گا۔ یہ دشمن کا "ان پھٹا" بم ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو بے ساختہ زبان پر آگیا کہ

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

انہوں نے' اس ویرانے میں' ایسی بے سروسامانی کے عالم میں' بڑی محبت سے چائے

پلائی۔ چائے کے دوران گفتگو میں نہر کے پل کا ذکر آگیا۔ کہنے لگے کہ اس کی داستان بڑی لرزہ انگیز اور ساتھ ہی حوصلہ افزا ہے۔۔۔ 6 ستمبر کو صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب، دشمن اس پل کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کے پیچھے امرتسر تک، سپاہ کا ایک سیلاب بلا انگیز ٹھاٹیں مارتا آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کا ایک بے پناہ سلسلہ ان کے جلو میں تھا۔ انکے اور پاکستان کے درمیان یہی ایک پل تھا۔ عام لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ ہم نے اس پل کو فوراً توڑ دیا اور یوں لاہور محفوظ ہوگیا۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ پل شام کے ساڑھے چار بجے تک نہیں ٹوٹا تھا، ایک مرتبہ کوشش کی تو اس میں صرف دراڑیں پڑیں۔ آپ سوچئے کہ یہ وقت کس قدر نازک تھا۔ اس ذرا سے ٹکڑے پر مسلسل دس گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی جاری رہی۔ ہمارے دلوں میں یہ احساس قیامت بپا کر رہا تھا کہ اگر ایک دفعہ دشمن نے اس پل کو عبور کر لیا تو پھر اس کا مسمار کرنا شاید ناممکن ہو جائے اور اس کے بعد جو کچھ لاہور پر گزر سکتی تھی اس کے تصور سے بھی آج روح کانپتی ہے۔ اس احساس نے پل کے اس طرف جانبازوں کی ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی اور اس دیوار نے دشمن کے سیلاب بے پناہ کے روکنے میں جو کچھ کر دیا اس کی مثال شاید ہی تاریخ کے اوراق پیش کر سکیں۔ مسلسل دس گھنٹے تک یہ صبر آزما کشمکش جاری رہی۔ تاآنکہ، ہمارے قابل صد افتخار، جانباز سپاہی، میجر آفتاب (میجر آفتاب، ہمارے ایک مرحوم دوست کے قابل فخر خلف الرشید ہیں اور اب تو پوری ملت کے لئے باعث صد افتخار ہیں۔ ویسے بھی وہ گلبرگ میں ہمارے قرب میں رہتے ہیں، اللہ انہیں ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔) نے، واقعی ہتھیلی پر سر رکھ کر، اسے توڑ ڈالا۔ فوج نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور دشمن خاسر و نامراد، منہ تکتا رہ گیا۔ یہ ہے وہ پل جس کی ٹوٹی ہوئی سلوں پر، ان سرفروشوں کی داستان عظمت، انمٹ حروف میں نقش ہو چکی ہے۔ اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ و اولئک ھم المفلحون

(2:157)-

ہم باہر نکلے تو نمعلوم کیوں۔ ترنگے جھنڈے پر میری نگاہ بلاشعور جا پڑی۔۔۔ پاکستان کی سرزمین پر بھارت کا جھنڈا!۔۔۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔۔۔ میری آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ کمانڈر نے دیکھا تو میرے مونڈھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ مت گھبرایئے۔ چند دنوں تک اسے برداشت کر لیجئے۔ جس دن فائر بندی کا حکم واپس لیا گیا اس دن آیئے گا اور پھر دیکھئے گا کہ اس جھنڈے کی دھجیاں کس طرح فضا میں اڑ رہی ہیں۔۔ اور اتنے میں' میں مشورہ دوں گا کہ آپ کھیم کرن ہو آیئے۔ تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی آپ کے سامنے آجائے۔

کھیم کرن

چنانچہ 21 اکتوبر کی شام ہم کھیم کرن کے محاذ کی طرف گئے۔ قصور سے جب شاہراہ چھوڑ کر' ہم کھیم کرن کی طرف مڑے ہیں تو سب سے پہلے پھر اسی نہر کو سلامی دی جسے میں نے ابھی ابھی پاسبان پاکستان اور باب السلام کہہ کر پکارا ہے۔ نہر کو پار کیا تو سامنے ایک وسیع و عریض میدان تھا جس میں بھارت کے شکستہ ٹینک یوں بکھرے پڑے تھے جیسے ڈھور ڈنگروں کے ہڈیوں کے ڈھانچے ہوں۔ اس سے یہ نظر آیا کہ دشمن ایک وقت میں یہاں تک بڑھ آیا تھا۔ تھوڑی دور آگے گئے تو پاکستان کی سرحد ختم ہو گئی اور اب ہمارے قدم اس سرزمین پر تھے جسے ہم نے بھارت سے فتح کر کے حاصل کیا ہے۔

اس مقام پر' یک لخت' اٹھارہ سال پہلے کا ایک ایسا واقعہ ابھر کر شعور کی سطح پر آگیا جو اس سے پہلے کبھی یاد نہیں آیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت' جب میرا دہلی سے روانہ ہونے کا دن آیا' تو دفتر کے ہم عصر ہندوؤں نے مجھے الوداعی پارٹی دی تھی۔۔۔ یہ قوم بھی عجیب و غریب واقع ہوئی ہے۔ یہ مجھے پس پشت "اورنگا" (اورنگ زیب کا سکھا شاہی' حقارت آمیز تلفظ) کہہ کر پکارا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی پارٹیاں بھی دیا کرتے تھے اور پھر پارٹی بھی ہندوستان کو چھوڑتے وقت۔ یا للعجب! پارٹی کے بعد جب

رخصت ہونے لگے تو ان میں سے ایک بے تکلف ہمکار نے کہا کہ "چوہدری صاحب! پھر دہلی کب آؤ گے"۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "جب دہلی فتح کر لیں گے"۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے اس اٹھارہ برس میں سرزمین ہند پر قدم تک نہیں رکھا اور آج پہلی دفعہ ہندوستان کی سرزمین کے اس رقبے پر قدم رکھا جسے ہم نے فتح کیا ہے۔ یہ واقعہ یاد آیا اور یوں محسوس ہوا جیسے پاؤں کے تلوے سے ایک لہر اٹھی ہے اور برق تپاں بن کر رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے۔ جذبہ تشکر سے میرا سر نیاز بدرگاہ رب العزت جھک گیا۔

اب راستے میں رکنے کو جی نہیں چاہتا تھا اس لئے تیزی سے آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر میں ہم کھیم کرن کے سامنے تھے۔ ہمارے سامنے کھیم کرن نہیں تھا۔ عبرت و موعظت کی ہزار داستانوں کا مرقع تھا۔ ایک ایسی بستی جو ابھی چند دن پہلے پندرہ بیس ہزار۔۔۔ نفوس کا جیتا جاگتا مسکن تھی' اب کھنڈرات کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس کا کوئی مکان ایسا نہیں تھا جس پر چھت موجود ہو۔ کوئی دیوار ایسی نہیں تھی جو صحیح و سالم کھڑی ہو۔ کوئی دروازہ یا دریچہ ایسا نہ تھا جو جل کر کوئلہ نہ ہو گیا ہو۔ وہاں وحشت ہی نہیں دہشت کا کیا عالم تھا' آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ ساری بستی میں کوئی ایک سانس لینے والا بھی نہیں تھا۔ بڑا ہی ڈراؤنا منظر تھا۔ اکثر مکانات پرانے زمانے کی چھوٹی اینٹوں کے قلعہ نما محل تھے جس سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ قصبہ قدیم زمانے سے آباد چلا آرہا تھا۔ لیکن اب اس کے کھنڈرات کی ایک ایک اینٹ پر یہ منقوش تھا کہ

فکاین من قریة اهلکنها و هی ظالمة فهی خاویة علی عروشها و بئر معطلة و قصر مشید ○ (22:45)-

کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے تباہ کر دیا کیونکہ وہاں کے رہنے والے ظالم تھے۔ ان میں اب کوئی بھی نہیں بستا۔ وہ اس طرح اجڑی ہوئی ویران پڑی ہیں کہ ان کے کنویں بیکار ہو چکے

ہیں۔ ان کے بڑے بڑے مستحکم قلعے اور محلات کھنڈرات میں
تبدیل ہو چکے ہیں۔

اس لئے فاعتبروا یا اولو الالباب۔

کھیم کرن سے دو تین میل اور آگے بڑھے تو اس مقام تک پہنچ کر رک گئے جہاں سے آگے جانا خطرہ سے خالی نہیں سمجھا جاتا کیونکہ تھوڑی دور آگے ہندوؤں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں سے ہماری سرحد سامنے نظر آ رہی تھی۔ ادھر ہمارے سپاہی ان کے سامنے دو گز کے فاصلے پر دشمن کی فوج کا دستہ۔ درمیان میں کوئی حفاظتی دیوار نہیں!

اس مقام پر ایک نوجوان کمانڈر تھا۔۔۔ غالباً" صوبیدار۔۔۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ کہنے لگا کہ وہ 6 ستمبر کی صبح اس محاذ پر آگیا تھا۔ ساری جنگ لڑی۔ دشمن کو دھکیلتا ہوا یہاں تک لے آیا' اور اس دن کے بعد اس وقت تک یہیں مقیم ہوں۔ اس محاذ کی داستان بیان کرنے والا اس سے زیادہ ثقہ راوی اور کون ہو سکتا تھا۔ اس نے چشم دید واقعات سنائے۔۔۔ وہ واقعات سنا رہا تھا اور ہم دم بخود ساکت و صامت کھڑے دل میں کہہ رہے تھے کہ یااللہ ! اب بھی تیرے بندوں میں ایسے جری اور بے باک موجود ہیں جو اس قسم کے محیر العقول کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں؟۔ یہ یقیناً اسی آدم کی اولاد ہیں جس کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز تھے۔

میں نے اس سے کہا کہ صوبیدار صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ آپ 6 ستمبر کی صبح سے 8 کی شام تک مسلسل لڑتے رہے۔ اس دوران میں کھانے پینے کا کیا رہا؟ یہ سن کر اس نے میری طرف عجیب حیرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر صرف اتنا کہا کہ میاں صاحب! کھانا پینا بیکار وقت کا مشغلہ ہے۔ کام میں اس کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ چنوں کی پوٹلیا میرے پاس تھی۔ تین دن تک بندھی کی بندھی رہ گئی۔

نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی جو بھری تھی خم میں بھری رہی

میں نے کہا کہ ہمارے (وہ) اگلے سپاہی' دشمن کے سپاہیوں سے دو ہی قدم کے فاصلے پر ہیں۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ وہ کوئی شرارت تو نہیں کرتے؟۔۔۔ کہنے لگا کہ ہاں! وہ ان سے چھ گنا زیادہ ہیں۔ لیکن صاحب! ہماری قسمت کہاں کہ وہ کوئی شرارت کریں۔ ان کمبختوں سے تو غلطی سے بھی کوئی فائر نہیں ہوتا۔ ہم تو تنگ آگئے۔ آپ ہی سوچئے۔ کب تک کوئی لبلبی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے!

اس میدان میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ فضا پر وحشت طاری تھی۔ یہ حالت دن میں تھی۔ رات کو یہاں کس قدر خوفناک تاریکی ہو گی۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔۔ میں نے کہا۔۔۔ صوبیدار صاحب! آپ لوگوں کو تنہائی نہیں ستاتی۔ یہ سن کر اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور ایک ایسی آواز سے جس میں اعتماد کی پوری قوت جھلک رہی تھی' کہا کہ تنہائی! یہ آپ نے کیا کہا۔ ہم تنہا نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ دس کروڑ پاکستانیوں کی دعائیں ہوتی ہیں۔ یہ ہمیں نہ کبھی اداس ہونے دیتی ہیں نہ مایوس۔ ہم کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ آپ سب بھائی ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔۔۔ ہم تو جیتے ہی آپ کے سہارے ہیں۔

وہ یہ کہہ رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے ہاتھ چومے۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھی نم آلود تھیں۔ ان میں خوشی کے آنسو تھے۔

شام ہو رہی تھی۔ ہم نے بچوں کی فرمائش پوری کرنے کے لئے وہاں سے کچھ تحائف اکٹھے کئے۔۔۔ ٹوٹے ہوئے ٹینکوں کے ٹکڑے۔ چلے ہوئے کارتوس۔۔۔ توپ کے گولوں کے خول۔۔۔ ان سے بڑھ کر اور کیا تحائف ہو سکتے تھے!

راستے میں شام ہو گئی تو سڑک کے کنارے کچھ سپاہی کھانا لے کر بیٹھے تھے۔ ہم نے سلام کیا تو وہ ہمیں گھیر کر کھڑے ہو گئے کہ صاحب! کھانا کھا کر جایئے۔ ہم نے بڑی معذرت کی' اور کہا کہ گاڑی ہمارے پاس ہے۔ ہم ابھی گھر پہنچ جائیں گے۔ آپ

جنگل میں ہیں۔ آپ کھانا کھائیے۔ لیکن وہ بھلا کب چھوڑنے والے تھے۔ کھانا الگ رکھ کر بیٹھ گئے کہ جب تک آپ شریک نہیں ہوں گے ہم نہیں کھائیں گے۔ اس کے کیا معنی کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو۔

اس کے کیا معنی کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو۔

اس ان پڑھ سپاہی نے نہایت سادگی سے یہ الفاظ کہے اور نہ معلوم مجھے کہاں سے کہاں لے گیا۔ میں نے جی میں کہا کہ اے کاش ! یہ بات کہیں ہماری سمجھ میں آجائے تو آج ہی دنیا کی تاریخ کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اسلام یہی تو کہنے آیا تھا کہ دیکھنا ! ایسا نہ ہو کہ ایک شخص کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو !

سپاہی مصر تھے۔ ہم حیران کہ ان کے کمانڈر نے مفاہمت کی راہ نکالی اور ہم سے کہا کہ صاحب ! آپ ایک ایک لقمہ لے لیجئے۔ یہ اس کے بغیر نہیں کھائیں گے۔

وہ ایک لقمہ میرے لئے حاصل زیست تھا۔۔۔ ایک مرد مجاہد سے ہم نوالہ ہونے کی سعادت۔۔۔۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!

چونڈہ

جنگ کے ان محاذوں کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک میدان کارزار کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا جائے اس امر کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے جانفروش مجاہدوں نے کس قسم کے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس جنگ میں سیالکوٹ سیکٹر میں ٹینکوں کی جو بے پناہ مڈ بھیڑ ہوئی تھی، اور ہمارے کوہ پیکر نوجوانوں نے جس بے جگری اور سرفروشی سے اس کا مقابلہ کیا تھا، اس کی داستانوں کی گونج مدت تک سنائی دیتی رہے گی۔ اس لئے اس محاذ کو دیکھنے کو بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن محاذ پر جانے کا فائدہ اسی صورت میں ہے کہ۔۔۔ کوئی فوجی افسر ساتھ ہو۔۔۔ کہ سنگ

وحشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا۔۔۔ ہماری خوش بختی سے، اس محاذ پر ہمارے دو قرآنی دوست تعینات تھے۔ ان کے حسن توسط سے ہماری یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ 20 نومبر کی صبح ہم اس محاذ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ڈسکہ کے مقام پر، ایک قرآنی رفیق ملک ضیاء اللہ صاحب کا مکان سڑک کے کنارے واقع تھا۔ انہوں نے ازرہ حسن تواضع، ناشتہ کے لئے روک لیا۔ تنہا، ناشتہ کی کشش تو شاید ہمارے لئے عناں گیر نہ ہوتی لیکن ان کی چھوٹی چھوٹی بچیوں نے جس معصومانہ انداز سے ہمارا پرتپاک استقبال کیا، اس نے نہ صرف یہ کہ ہمیں آگے بڑھنے نہ دیا بلکہ ہم وہاں کافی دیر تک رکے رہے۔ کس قدر خوش بخت ہے وہ گھرانا جس کی فضا قرآنی فکر سے معمور ہو۔

طے یہ تھا کہ ہمیں پسرور کے ریلوے اسٹیشن پر، فوجی راہ نما مل جائیں گے تاکہ ہم باسانی آگے جا سکیں۔ ڈسکہ میں جو ہمیں کچھ دیر ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ ان راہنماؤں کی جیپ پسرور سے ڈسکہ کی طرف چلی آ رہی ہے۔۔۔ اور جیپ میں سپاہی نہیں تھے۔۔۔ خود ہمارے معزز میزبان تھے۔ اس گرمجوشی سے ملے کہ ان کے سینے کی حرارت نے ہمارے عروق جامد میں خون زندگی دوڑا دیا۔ کس قدر صحیح کہا تھا حکیم الامت نے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وہاں سے ہم سیدھے چونڈہ گئے۔۔۔ جسے سیالکوٹ کی ٹینکوں کی جنگ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت چونڈہ کے میدان میں لڑی گئی تھی۔۔۔ ہمارے قومی ترانوں میں چونڈہ کا نام ضرور آنا چاہئے تھا۔۔۔ قصبہ بے آباد تھا۔ اس کے باہر ایک ٹیلہ پر چڑھے تو سامنے وہ وسیع و عریض میدان تھا جس میں یہ محیرالعقول اور عدیم النظیر معرکہ سر ہوا تھا۔ جموں کے اطراف سے نیچے اتریئے تو سامنے میلوں لمبا چوڑا میدان ہے۔۔۔ بالکل ہموار۔۔۔ نہ کوئی ٹیلہ نہ چٹان۔ نہ ندی نہ نالہ۔ حتیٰ کہ درخت بھی کہیں کہیں اکا دکا

کھڑے ہیں۔ اس قسم کا میدان ٹینکوں کی لڑائی کے لئے بڑا ساز گار ہوتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ دشمن نے اس یورش کے لئے اسی میدان کو منتخب کیا تھا۔ وہ پہلے ہلہ میں چونڈہ تک پہنچ چکا تھا۔۔۔ شہر اور ریلوے اسٹیشن اس کے قبضہ میں تھا۔ کہ ہمارے جانباز وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے پھر جو کچھ کر کے دکھایا' آسمان کی آنکھوں نے کاہے کو اس سے پہلے کبھی دیکھا ہو گا۔ تعداد میں کہیں کم۔ ساز و یراق کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسرے محاذوں پر لڑنے کے بعد یہاں پہنچے ہوئے۔۔۔ تھکے ماندے۔۔۔ لیکن عقاب کی نگاہیں اور چیتے کا جگر لئے ہوئے' خدا کی اس صفت کے مظہر کہ۔۔۔ **لا تاخذہ سنۃ ولا نوم** (2:255)- نہ اس پر اونگھ غالب آتی ہے نہ نیند۔۔۔ ہمارے دونوں میزبان دوست (جو اعلیٰ افسر ہیں) شمشیر بکف اور کفن بدوش اس محاذ کے اندر تھے۔ انہوں نے' ایک ایک مورچہ پر پہنچ کر جو "آپ بیتی" سنائی ہے تو باور کیجئے' ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ لیکن اس "آپ بیتی" میں اپنے کارناموں کا ذکر محض بر سبیل تذکرہ' اور وہ بھی انتہائی انکسار کے ساتھ۔ سارا (Credit) اپنے رفقاء کو دیتے ہوئے۔۔۔ اور رفقاء کا یہ عالم کہ وہ رہ رہ کر ہمارے کانوں میں کہتے چلے جاتے تھے کہ یہ سب کچھ انہوں نے خود کیا تھا' ہمارا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ کیسی حسین و دل کش تفسیر تھی یہ **یوثرون علی انفسھم** کی (کہ مومنوں کی شان یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ ہماری فوجوں نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے' آپ کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ یہ کیسے ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اس کے وجوہ و علل تو بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک عنصر ایسا ہے جو میرے نزدیک بڑا اہم ہے۔ لڑائی کا عام نقشہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے آگے پیدل سپاہی ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے چھوٹے افسر۔ جوں جوں پیچھے ہٹتے جایئے' افسروں کا درجہ بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً سب سے آگے کیپٹن۔ اس سے پیچھے میجر۔ پھر بریگیڈیئر۔ حتیٰ کہ جرنیل کا مورچہ یا ہیڈ کوارٹر'

محاذ جنگ سے میلوں پیچھے ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ہماری تعداد بہت کم ہے۔ ہم نے لڑائی کا نقشہ الٹ دیا۔ ہم نے افسر اور سپاہی کا امتیاز اٹھا دیا۔ چنانچہ افسر اگلی صفوں میں سپاہیوں کے دوش بدوش کھڑے تھے۔ ہمارے سپاہیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک زخمی افسر کو بچانے' حتیٰ کہ ایک افسر کی لاش کو دشمن کے قبضے سے چھڑانے کے لئے' بیسیوں سپاہی اپنی جان دیدتے ہیں۔ ان سپاہیوں نے جب دیکھا کہ افسر خود ان کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں تو انہوں نے' ان سے بھی آگے بڑھ کر موت کو گلے لگایا۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے افسروں کی اموات (شہادت) کی نسبت اس قدر زیادہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے اور یہی وجہ درحقیقت ہماری اس قدر حیرت انگیز کامیابیوں کی ہے۔

ہمارا دوست یہ کچھ بیان کر رہا تھا اور میرے سامنے قرآن کریم کے اس مقام کے رموز و اسرار ایک ایک کر کے کھلتے جا رہے تھے جہاں اس نے کہا ہے کہ **لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة** (33:21)۔ جنگ احزاب میں' مسلمان فوج پر (قرآن کے الفاظ میں) "ایسا سخت کا وقت آگیا کہ دشمن کے لشکر چاروں طرف سے امنڈ کر آگئے تھے۔ خوف کے مارے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا' اور دہشت سے ان کے دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اچھل کر حلق تک آپہنچیں گے"۔ ایسے حوصلہ شکن اور ہمت طلب حالات میں' ان کا کمانڈار (یعنی حضور نبی اکرمؐ) بہ نفس نفیس ان کے شانہ بشانہ چٹان کی طرح کھڑا تھا اور دشمن کی یلغار کی تلاطم انگیزیاں اس کے پائے ثبات میں ذرا سی لغزش پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ یہ تھا وہ مقام جہاں ان مجاہدوں سے کہا گیا کہ

کس قدر حسین تھا وہ نمونہ جو تمہارے رسول نے تمہارے لئے
پیش کیا تھا۔

اور حضور رسالتمابؐ کے اسی اسوۂ حسنہ کا اتباع تھا جس نے ہماری حالیہ جنگ میں لڑائی

کا نقشہ الٹ دیا تھا۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا اور میرے دوست کے چہرے پر مسرتوں کی سرخی پھیل رہی تھی۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر باعث مسرت و افتخار اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کا قدم' حضور رسالتمابؐ کے اتباع میں اٹھا اور اس کا ایسا خوشگوار نتیجہ سامنے آیا۔۔۔ میرے دوست نے فخر و مسرت کے ملے جلے جذبات سے کہا کہ "آپ نے آج کس طرح ہماری نگاہوں کا رخ پھیر دیا ہے۔ میرے رفقائے ہم عنان کو ان کے اقدام کی اس درخشندہ تعبیر سے کس قدر خوشی ہو گی!"

ہم اس میدان کے ولولہ انگیز ماحول میں پھر رہے تھے' اور جس مقام پر کوئی محیر العقول کارنامہ سامنے آتا تھا' ان مجاہدوں کے لئے' جن میں سے کچھ اس وقت بھی ہمارے ساتھ ہی تھے' میرے لب پر بے ساختہ زمزمہ تبریک و تہنیت آجاتا تھا۔ ان میں ایک نوجوان افسر تھا۔ بڑا تیز اور ذہین۔ اس نے مجھ سے' کچھ رازدارانہ انداز سے' آہستہ سے کہا کہ مجھے ایک بات بتایئے۔ آپ ہمارے ان کارناموں پر' قدم قدم پر ہماری تعریف و توصیف کے گیت گا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ غیب کی قوتوں نے کیا۔ ہمارا نشانہ ٹھکانے لگا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گولہ ہمارے توپچی نے نہیں پھینکا تھا۔ کسی سبز پیرہن بزرگ نے پھینکا تھا۔ ہم نے اپنی جانیں دے کر' دشمن کو پسپا کیا تو وہ ہم نے نہیں کیا' سفید گھوڑیوں پر سوار روحانی فوج نے کیا۔ جب یہ سب کچھ ان غیبی قوتوں نے کیا تو اس میں ہمارا (Credit) کیا ہے! میں نے دیکھا کہ اس کی اس تنقید میں طنز سے کہیں زیادہ ملال اور افسردگی کا پہلو نمایاں تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ اف! یہ افسانے (جنہیں خواہ بطور سازش پھیلایا گیا ہو یا برنائے جہالت) کس قدر حوصلہ شکن نتائج پیدا کر گئے ہیں۔ ہمارے وہ جانباز مجاہد' جنہیں اپنے کارناموں پر' فخر سے سر اٹھا کر چلنا چاہئے تھا' ان افسانوں سے ان کے دل بجھ گئے ہیں۔ یہی وہ خطرہ تھا جس کے پیش نظر طلوع اسلام نے یہ کہا تھا کہ

ان حقیقتوں کو افسانے نہ بننے دیجئے

مجھے بتایا گیا کہ ان سپاہیوں نے یہ کچھ صرف اخبارات میں نہیں پڑھا۔ ہمارے جو بزرگ ان محاذوں کو دیکھنے آئے ہیں' انہوں نے بھی ان سے یہی کچھ کہا ہے اور اس سے ان پر غیر شعوری طور پر بڑا حوصلہ شکن اثر ہوا ہے۔

میں نے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ عزیزم! ذرا اتنا سوچو کہ اگر یہ کارنامے ان غیبی قوتوں نے سرانجام دیئے ہیں تو پھر "نشان حیدر" میجر عزیز بھٹی (شہید) اور "ہلال جرات" ملک اختر کو کیوں دیا جا رہا ہے؟ نوجوان بڑا ذہین تھا۔ ایک ثانیہ میں بات کی تہ تک پہنچ گیا اور کہنے لگا کہ "پھر قوم میں یہ (Dual Personality) کیوں کارفرما ہے؟" میں نے کہا کہ اس کے متعلق' میں تفصیل سے' فرصت کے وقت بات کروں گا۔

اور یہ فرصت مجھے اس وقت مل گئی جب ہم میس کے باہر' دوپہر کے کھانے کے بعد بیٹھے۔ اس مجلس میں' آفیسرز بھی تھے اور جوان بھی۔ اس سے پہلے' فوجیوں کے اس قسم کے ریمارکس بھی مجھ تک پہنچ چکے تھے کہ ہم سترہ برس تک کامل' اپنے اہل وطن کے طعن سنتے رہے۔ کوئی کہتا کہ یہ فوجی مفت میں بیٹھے قوم کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش اڑا رہے ہیں۔ کہیں سے آواز آتی کہ ان سے نہریں کھدوایئے۔ کوئی کہتا ان سے سڑکیں کنوایئے۔ پچھلے دنوں فوج کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تو ملک میں ایسے کہرام مچ گیا گویا فوج نے قوم کو لوٹ لیا ہے۔ ہم یہ سب کچھ سنتے تھے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ جب تک کوئی معرکہ سامنے نہ آئے' فوج کیا بتا سکتی ہے اور کیسے بتا سکتی ہے کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ خدا خدا کر کے یہ موقع ملا کہ ہم اپنی ہستی کا جواز' اور اپنے مقام کی اہمیت کا مظاہرہ کر سکیں۔ ہم نے ایسا کیا اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اہل ملک نے' جنگ کے دوران' اس کا دل کھول کر اعتراف کیا۔ لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی' یہ حکایتیں پھیلنی شروع ہو گئیں کہ یہ سب کچھ غیبی قوتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ فوج کا اس میں کیا ہے؟ اس سے ہم پھر اسی مقام پر آ گئے

جہاں پہلے تھے۔

میں اس قسم کی باتیں سن چکا تھا۔ اس لئے میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ضروری خیال کیا کہ اس باب میں قرآنی حقیقت کو ان کے سامنے پیش کر دوں۔ چنانچہ میں نے ان سے تفصیل سے باتیں کیں جن کا انداز یہ تھا کہ :

"عزیزان من ! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا کے پروگرام' غیبی قوتوں سے نہیں' بلکہ انسانی ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ قرآن کریم میں دیکھئے۔ جہاں مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ کی اجازت دی گئی ہے وہاں کہا گیا ہے کہ "اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش اور مستبد لوگوں کی روک تھام کے لئے انسانوں کی جماعتیں' اٹھ کھڑی ہوں' تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے" آپ نے دیکھا کہ دنیا میں' مستبد قوتوں کی روک تھام کا انتظام' انسانی جماعتوں کے ذریعے کرایا جاتا ہے اور دیکھئے ! مکہ کے مظلوم' اپنی حفاظت کے لئے خدا سے فریاد کرتے ہیں' اور مدد مانگ رہے ہیں۔ تم ان کی امداد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ آپ نے دیکھا کہ خدا ان مظلوموں کی امداد کے لئے کوئی غیبی قوت نہیں بھیجتا۔ مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم ان کی مدافعت کے لئے اٹھو۔ یہی وہ مجاہد ہیں جن کے متعلق وہ (خدا) کہتا ہے کہ یہ لوگ خوف و ہراس کے حوصلہ شکن حالات میں نہایت پامردی سے مقابلہ کے لئے کھڑے رہتے ہیں اس لئے ہم ان پر تہنیت و تبریک کے پھول برساتے ہیں (اولئک علیھم صلوات من ربھم و رحمة)۔ اس کے برعکس' ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی سپاہی' میدان جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگا تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ ان تمام مقامات میں آپ نے دیکھا کہ میدان جنگ میں فتح و کامرانی کا سبب' ان مجاہدین کے ثبات و استقامت اور جانبازی و سرفروشی کو قرار دیا جاتا ہے نہ کہ کسی غیبی قوت کو۔ اور اسی کے لئے انہیں اس قدر تاکید کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدین سے کہا تھا کہ اگر تم میں بیس سپاہی بھی جم کر' ثابت قدمی سے مقابلہ کریں گے تو وہ

دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آجائیں گے۔ اس میں دیکھئے کہ دشمن کے دو سو سپاہیوں کو مغلوب کرنے کے لئے بیس ثابت قدم مجاہدین کی ضرورت لاینفک قرار دی گئی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اگر تم میں سے کوئی بھی مقابلہ کے لئے کھڑا نہیں ہو گا تو بھی دشمن کے (کم از کم) ایک سو اسی سپاہی ہماری غیبی قوتوں سے تباہ کر دیئے جائیں گے اور پھر ان بیس کے لئے استقامت اور ثبات کی شرط ضروری سمجھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساز و سامان کی موجودگی بھی۔ کیونکہ وہیں یہ کہہ دیا گیا کہ یہ ایک اور دس کی نسبت پورے ساز و سامان کے ساتھ ہے۔ سردست' جب تم میں ساز و سامان کی مقابلتہ" کمی ہے' تم اپنے سے دوگنی تعداد پر بالضرور غالب آجاؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی بھی تاکید کر دی کہ تم اپنی سرحدوں کو گھوڑوں کے رسالوں سے خوب مستحکم رکھو۔ (اس زمانے میں بہترین استحکام کا یہی ذریعہ تھا)۔ یہ نہیں کہا کہ تم میدان جنگ میں چلے جاؤ۔ تمہاری سرحدوں کی حفاظت غیبی قوتیں کریں گی۔ اس لئے یاد رکھئے! اس جنگ میں جس قدر کامیابی ہوئی ہے' وہ آپ کی اور صرف آپ کی ہمتوں کا صدقہ ہے اور اس کا سہرا صرف آپ کے سر ہے۔ اس میں کسی "سبز پیرہن یا سفید قبا" والے کا کوئی دخل نہیں۔ آپ قوم کے نزدیک بھی در خور صد تعریف و ستائش ہیں اور خدا کے ہاں بھی مستحق ہزار درجات و مناصب"۔

میں یہ کہہ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہروں پر سرخی دوڑتی جا رہی ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو رہی ہے اور ان کے سینوں میں تازہ ولولے بیدار ہو رہے ہیں۔

ان میں سے ایک مجاہد نے (جو ذرا زیادہ عمر کا تھا) پوچھا کہ جس چیز کو تائید خداوندی کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کے متعلق بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر کام کے لئے قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ جو شخص ان قوانین کے مطابق کام کرتا ہے اسکا نتیجہ نفع بخش اور کامیابی کا ضامن ہوتا

ہے۔ اسے تائید خداوندی کہتے ہیں۔ یہ قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک قانون تو یہ ہے کہ جب آپ توپ کا رخ ٹھیک کر کے' صحیح زاویہ کے مطابق' عین وقت پر گولہ چلائیں گے تو وہ ٹھکانے پر لگے گا۔ دوسرا قانون یہ ہے کہ اگر آپ عدل اور انصاف کی خاطر جنگ کریں گے۔ آپ کا مقصد مظلوموں کی امداد ہو گا اور آپ جنگ میں بلند اخلاق کو پیش نظر رکھیں گے' تو آپ کے اندر ایسی قوتیں بیدار ہو جائیں گی جن سے آپ کا ایک ایک سپاہی' دس دس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اسے کہتے ہیں "خدا کی راہ میں لڑنا" اس طرح لڑنے والوں کو خدا نے "حزب اللہ" یعنی اللہ کا لشکر کہا ہے اور اس جنگ کو "خدا کی مدد کرنا" قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ ولن ینصر الله من ینصره (22:40)- "خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا جو خدا کی مدد کرے گا"۔ یعنی جو لوگ ان مقاصد کی خاطر جنگ کریں گے جنہیں خدا نے اچھا قرار دیا ہے اور جنگ میں ان امور سے مجتنب رہیں گے جن سے اس نے روکا ہے' تو انہیں ایسی جمیعت خاطر اور اطمینان قلب نصیب ہو گا جس سے ان کی ہمتیں بلند اور حوصلے زیادہ ہو جائیں گے اور خطرات کے مقابلہ کے وقت ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئے گی۔ اس کا نام تائید خداوندی ہے۔ لیکن یاد رکھئے۔ اگر آپ "توپ کے گولے والے" قانون میں۔۔۔ غلطی یا سستی کر جائیں گے تو اس کا نقصان ہو کر رہے گا۔ "جنگ احد میں' نبی اکرمؐ سپہ سالار اعظم تھے اور صحابہ کبارؓ سپاہ۔ یہ لشکر حق و صداقت کے لئے میدان میں نکلا تھا اس لئے انہیں خدا کی تائید حاصل تھی۔ لیکن جب ان کے ایک دستہ نے ذرا سی غلطی کی تو ان کی فتح شکست میں بدل گئی۔ (اور تو اور) خود نبی اکرمؐ کو بھی زخم آئے۔ کسی غیبی قوت نے انہیں' اس غلطی کے نقصان سے نہیں بچایا۔ حق کی خاطر لڑنا اور توپ کا رخ صحیح رکھنا' اس سے جو خوشگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں انہیں تائید خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس طرح جنگ کرنے کا بھی سارا (Credit) مجاہدین کو ملتا ہے۔ ان مجاہدین کو جن کے ہاتھوں خدا کے پروگرام تکمیل تک پہنچتے ہیں' یہی وہ

حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

اللہ کو پامردئی مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ایک نوجوان نے کہا کہ روحانی قوت بالآخر ہوتی ہی ہے نا! میں نے کہا کہ ہاں ہوتی ہے، لیکن وہ مجاہد کے دست و بازو میں ہوتی ہے۔ یہی وہ دست و بازو تھے جن کی حیرت انگیز قوت کو دیکھ کر خود خدا نے کہا تھا کہ "میدان جنگ میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ تم تلواروں کا وار نہیں کر رہے تھے، ہم کر رہے تھے"۔ یاد رکھئے۔۔۔ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ۔۔۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ خدا نے مجاہدین کے گھوڑوں کے سموں سے اڑنے والے گرد و غبار کی قسم کھائی ہے۔ ان کے نعلوں سے ابھرنے والی چنگاریوں کی قسم کھائی ہے۔ کسی "روحانی قوت" کے مدعی کے تسبیح و مصلے کی قسم نہیں کھائی۔ اس لئے مجاہد کا مقام سب سے اونچا ہے۔ آپ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ان قرآنی بصائر کا نتیجہ تھا کہ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے ہیں تو وہاں کی فضا بدل چکی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد، مجھے خط موصول ہوا اس میں تحریر تھا کہ

اس رجمنٹ کے سب افسران اور جس جس جوان سے آپ ملے نہایت متاثر ہوئے۔ ان کا (Morale) تا بفلک جا پہنچا۔ (دوبارہ) جنگ سے پہلے کہیں آپ سے دوچار باتیں سن لیں تو کم از کم اس یونٹ کے جوان بخوشی سردھڑ کی بازی لگا لیں۔

مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ فالحمد للہ۔

جنگ احد میں جب مسلمان مجاہدین کو اپنی ایک غلطی سے شکست ہوئی تو اس کا ان کے دل پر برا اثر ہوا۔ اس بددلی کے ازالہ کے لئے قرآن کریم نے ان سے کہا کہ تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ **ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثله و تلک الایام نداولها بین الناس** (3:139)۔ اگر آج تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو اس سے پہلے اس قسم کا زخم تم فریق مخالف کو لگا چکے ہو۔ یہ جنگ کا میدان ہے۔ اس میں پلڑے جھکتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ اگر کسی وقت' کسی غلطی یا لغزش سے' وقتی طور پر شکست ہو جائے تو اس سے ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ دوسرے وقت میں اس کا ازالہ ہو جائے گا۔

واہگہ کی سرحد پر اپنا کچھ نقصان دیکھ کر مجھ پر جو کچھ تھوڑی سی افسردگی طاری ہوئی تھی' اس کا ازالہ کھیم کرن کا محاذ دیکھنے سے ہو گیا۔ سیالکوٹ کے محاذ پر ہمارا کچھ علاقہ دشمن کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اس کا اثر زائل کرنے کے لئے مجھ سے کہا گیا کہ اب تم چھمب کا محاذ دیکھ آؤ۔ کھیم کرن میں اگر تمہیں "**قرح مثله**" نظر آیا تھا تو چھمب میں تمہیں **قد اصبتم مثلیها** (3:164) دکھائی دے گا۔ یعنی جس قدر نقصان دشمن نے تمہیں پہنچایا ہے۔ تم اس سے دگنا نقصان اسے پہنچا چکے ہو اور اگر راجستھان کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو پھر دشمن کا نقصان ہم سے چار گنا ہو جاتا ہے۔

چھمب جوڑیاں سیکٹر

چنانچہ 22 دسمبر کی دوپہر ہم چھمب کے سیکٹر کی طرف روانہ ہوئے۔ رات جلال پور جٹاں میں گزاری۔ پروگرام تو یہی تھا کہ وہاں خاموشی سے رات گزار کر آگے چلے جائیں گے لیکن شدہ شدہ قرآنی احباب کو اطلاع مل گئی۔ تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ اس طرح قرآن کی باتیں بھی ہو گئیں اور بہت سے قدیمی دوستوں سے ملاقات بھی۔ جن تعلقات کی بنیاد' پرخلوص قرآنی رشتہ پر ہو۔ ان میں جس بے لوث محبت کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کی مثال کسی اور رشتے میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ یہ مختصر سی محفل اسی

جذبہ کی حسین یادگار تھی۔ اس پر ہمارے میزبان عزیز میر عبدالغنی صاحب اور محترم مرزا غلام حسین صاحب کا حسن تواضع۔۔۔ وجہ نشاط قلب و نظر تھا۔ اس پر سرور فضا میں رات بسر ہوئی اور 23 کی صبح ہم جانب منزل روانہ ہو گئے۔

جلال پور جٹاں سے قریب دس میل کے فاصلہ پر (بمقام ٹانڈہ) ہمارے فوجی راہنما مل گئے۔۔ ایک نہایت ذہین' پر خلوص اور شگفتہ مزاج فوجی ڈاکٹر جن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس محاذ کی پوری جنگ میں وہ بذات خود شریک تھے۔ اس لئے وہ راستہ بھر فوج بیتی نہیں بلکہ (یوں کہئے) کہ آپ بیتی سناتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوجی معرکہ آرائی کا صحیح اندازہ ہو ہی اس وقت سکتا ہے کہ میدان کار زار آپ اپنے قدموں سے ناپیں اور حدی خواں وہ ہو جس نے اس معرکہ میں خود حصہ لیا ہو۔ ٹانڈہ سے تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ سڑک کے کنارے ایک طرف' سرخ حروف میں نوشتہ ایک کتبہ نظر آیا جس پر لکھا تھا

"LIBERATED AREA"

میری نگاہیں ان حروف پر تھیں اور زبان پر ندائے آسمانی کی یہ نشید جانفزا کہ **واورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم و ارضالم تطؤھا۔** (33:27)- "اس نے تمہیں ان دشمنوں کی زمینوں کا' ان کی بستیوں کا' انکے مال و دولت کا وارث بنا دیا اور اس سرزمین کا بھی جس پر ہنوز تمہارے قدم نہیں پڑے تھے"۔ ایک طرف یہ حیات آور احساس اور دوسری طرف اس کتبہ کے الفاظ کا حسن انتخاب' جو گزشتہ اٹھارہ سال کے ماجریات کی منہ بولتی تصویر تھے۔

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

تھوڑی دور آگے چھمب کا ویران شدہ قصبہ تھا۔ جس کے تھانے میں ہماری پولیس تھی۔ اس تھانے کی تصاویر' اس علاقہ کی فتح کے ساتھ' سب سے پہلے اخبارات میں

شائع ہوئیں تھیں۔ اب وہ خود ہمارے سامنے تھا۔ اندر گئے تو تھانے کے انچارج پولیس آفیسر نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ چائے کی پیش کش کی۔ لیکن آگے بڑھنے کی شدت اشتیاق نے معذرت خواہی پر مجبور کر دیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ یہاں سے جوڑیاں' جو ہمارے سفر کی آخری منزل تھی۔ بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن ہمارے عزیز راہنما نے' بہ کمال شفقت کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پورے راستے کو دیکھیں جس سے ہماری فوجیں گذر کر جوڑیاں پہنچی تھیں۔ تاکہ سارے محاذ کا نقشہ آپ کے سامنے آجائے اور سفر کے بعد جا کر اس کا احساس ہوا کہ یہ ہمارے اس رفیق محترم کا خلوص تھا جس کی وجہ سے انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا۔۔۔ وہ راستہ جس کا طے کرنا۔۔۔ لانا تھا جوئے شیر کا۔۔۔ ورنہ اگر وہ ہمیں سیدھے جوڑیاں لے جاتے۔ تو ہم پھر بھی ان کے شکر گذار ہوتے۔ لیکن اس طرح ہم وہ کچھ کھو دیتے جسے ہم شاید دوبارہ نہ پا سکتے۔

اس راستے کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ہم قریب ساٹھ میل کی مسافت طے کر کے جوڑیاں پہنچے تھے۔ اس تمام سفر میں بیشتر حصہ ایسا تھا۔ جس میں سڑک تو ایک طرف نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ نشان راہ۔ سارا راستہ پہاڑی نالوں کے بڑے بڑے پتھروں سے پٹا پڑا تھا۔ جن پر سے جیپ گزرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے زلزلہ آ رہا ہے۔ پھر ان پتھروں میں سروقد سرکنڈے کے "جنگل"۔۔۔ واقعی جنگل جن میں چار قدم تک بھی نگاہ صاف نہیں جا سکتی تھی۔ یہ تھا ہماری فوج ظفر موج کا محاذ جنگ۔۔۔ تھوڑی دور آگے گئے تو پیر جمال کی سطح مرتفع پر دشمن کا پہلا مورچہ نظر آیا۔ مورچہ کیا تھا۔ ایک زمین دوز چھاؤنی تھی۔ لیکن اب اس کے صرف کھنڈرات باقی تھے۔

راستہ کے پتھروں سے ٹکراتے اور سرکنڈے کے جنگل کو چیرتے' میلوں آگے گئے۔ تو سامنے کی پہاڑی پر' دشمن کے پختہ مورچوں کے باقیات دکھائی دیئے اور نیچے ایک وسیع آبادی کی شکستہ سرنگوں عمارات' جن میں ادھر ادھر فوجی بکتر بند گاڑیوں کے

ڈھانچے بکھرے پڑے تھے۔ یہ ویوا کی چھاؤنی تھی۔ جو دشمن کا بٹالین ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس مقام پر ان سے سخت تصادم ہوا تھا۔

ان کھنڈرات میں' ایک طرف ایک چوکھنڈی کے اندر' ایک مزار تھا۔۔۔ کم از کم پینتیس چالیس فٹ لمبا۔ اس کے سرہانے "پیر کافی شاہ" کندہ تھا اور چاروں طرف تازہ جلی ہوئی موم بتیوں کے باقیات اس حقیقت کے غماز کہ یہ خانقاہ اب مرجع انام بن رہی ہے۔۔۔ اس قسم کی گولہ باری میں اس کا محفوظ رہ جانا۔۔۔ مدفون پیر صاحب کی کرامت کی زندہ شہادت بن جانے کے لئے کافی تھا۔۔۔ اصل یہ ہے کہ دنیا میں توہم پرستی کے خالق اسی قسم کے اتفاقی حادثات ہوتے ہیں اور پھر مرور زمانہ سے یہی اتفاقات اور ان سے منسلک خود تراشیدہ افسانے کرامات بن جاتے ہیں۔

یہاں سے آگے بڑھے تو دریائے توی کے کنارے منڈیالہ کراسنگ پر پہنچے۔ اس مقام پر بھارتی ایک بہت بڑا پل بنا رہے تھے۔ اس کی بنیادوں کے ستون ہمارے سامنے کھڑے تھے اور تعمیر کا باقی سامان کنارے پر پڑا ہر راہ رو سے کہہ رہا تھا کہ

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

دریائے توی یوں تو ایک پہاڑی نالہ ہے۔ لیکن اس کا خشک پاٹ بتا رہا تھا کہ برسات کے دنوں یہ ایک سیل بے پناہ بن جاتا ہو گا۔ ہمارے جیوش خدامست نے اسے ستمبر کے شروع میں عبور کیا تھا۔ اسے پار کیا تو سامنے وہ سڑک (پہاڑی راستہ کہئے) تھی۔ جو جوڑیاں کی طرف جا رہی تھی۔ چند میل آگے بڑھے تو دور سے پہاڑی کے اوپر ایک قدیم قلعہ نظر آیا۔ اسے قلعہ کلیت کہتے ہیں۔ دروازے پر لیفٹیننٹ کرنل شیو رام سنگھ (مارچ 1933ء) لکھا تھا۔۔۔ مارچ 1933ء کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ کیونکہ قلعہ کی عمارت تو سینکڑوں برس پرانی دکھائی دیتی تھی۔ قلعہ کے اوپر چڑھے تو اس کے محل وقوع کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس وقت مطلع ابر آلود تھا۔ ورنہ (کہتے تھے کہ) وہاں

سے گجرات' سیالکوٹ' جموں تک کی آبادیاں نظر آجاتی تھیں۔ اب بھی ہمارے سامنے بیسیوں میل کا علاقہ تھا۔ قلعہ کی پوزیشن ایسی تھی کہ اس پر اگر ایک سپاہی مشین گن لے کر کھڑا ہو جائے تو نیچے کتنی ہی فوج ہو۔ کسی کو قریب تک نہ آنے دے۔ لیکن ہمارے عساکر کے سیل رواں کے سامنے یہ قلعہ بھی ریت کی دیوار سے زیادہ مضبوط ثابت نہ ہوا۔۔۔ یقین محکم اور عزم راسخ دنیا میں کیا کچھ کر دکھاتا ہے۔!

اس سے ذرا آگے بڑھے۔ تو سامنے جوڑیاں کا ویران شدہ قصبہ تھا جس کے ڈاک بنگلہ میں اب ہمارا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔ لیکن جوڑیاں تک پہنچنے سے پہلے ذرا رکئے اور دیکھئے کہ وہ سامنے کیا نظر آتا ہے؟ یہ ٹروٹی کی پہاڑی ہے جس پر یہاں سے وہاں تک چاروں طرف تین تین منزل کے پختہ مورچے تھے۔ یہ مورچے دشمن کا قلعہ تھے۔ جس کے دامن میں جوڑیاں کا قصبہ تھا۔ اس پہاڑی کے نیچے سے گذر کر جوڑیاں کو فتح کرنا اور پھر اس سے آگے اکھنور تک جا پہنچنا۔۔۔ کم از کم ہمارے ذہن میں تو نہیں آسکتا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ ہم اس ورطہ جرات میں گم تھے کہ ہماری جیپ ڈاک بنگلہ کے احاطہ میں جا پہنچی۔ وہیں آفیسرز میس تھا۔ ہم نے جہاں بھی اپنے جیالے نوجوانوں کو دیکھا۔۔۔ وہ افسر تھے یا جوان۔۔۔ انہیں ہر جگہ شگفتہ و شاداب پایا۔ مجھے کہیں کسی ایک جگہ بھی کوئی ایسا فوجی نظر نہیں آیا۔ جو افسردہ یا تنگ مزاج ہو اس دن لندن بی بی سی کا ایک نمائندہ بھی بغرض سیاحت وہاں آیا ہوا تھا۔ زیادہ وقت اسی کے ساتھ گفتگو میں گذرا۔ خوراک کے مسئلہ پر بھارت کے واویلے کا ذکر آیا۔ تو ایک افسر نے کہا کہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جب ہم نے اس مقام (جوڑیاں) پر قبضہ کیا ہے۔ تو یہاں شہری گوداموں کے اندر اس قدر فاضلہ غلہ بھرا پڑا تھا۔ جو ان سے دو تین سال تک بھی ختم نہ ہوتا۔ (یہی کچھ ہم نے چھمب کرن میں سنا تھا) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بھارت کی چیخ و پکار کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے۔ شہری آبادی کا ذکر آیا۔ تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے قبضہ کرنے سے پہلے یہ قصبہ خالی ہو چکا تھا۔ البتہ یہاں تیس چالیس

بوڑھے بوڑھے مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ یعنی ان کے عزیز رشتہ دار خود تو جان بچا کر بھاگ گئے اور اپنے ان سن رسیدہ بزرگوں کو پیچھے دشمن کے حوالے کر گئے۔۔۔ بعینہ یہی کچھ ہم نے کھیم کرن میں سنا تھا۔ اس سے آپ ہندو قوم کی ذہنیت کا اندازہ لگائیے۔ عقیدہ ان کا یہ ہے کہ مہاراج رام چندر نے اپنے پتا کے بچن کا پالن کیا۔ (یعنی اپنے والد کے دیئے ہوئے قول کو نبھایا) تو وہ ایشور کے اوتار ہو گئے اور عمل ان کا یہ کہ بھاگتے وقت اپنے بوڑھے والدین کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ماں باپ تو ایک طرف ان کی حالت یہ ہے کہ یہ گائے کو ماتا کہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں لیکن اس ماتا کے ساتھ ان کا سلوک یہ ہوتا ہے کہ (ہم ہندوستان میں دیکھا کرتے تھے کہ) جب تک وہ دودھ دیتی اسے پاس رکھتے۔ لیکن جونہی وہ بوڑھی ہو جاتی اسے یا تو دوسروں کی نظر بچا کر قصابوں کے ہاتھ بیچ دیتے اور یا گھر سے باہر نکال کر آوارہ چھوڑ دیتے۔۔۔ جو قوم اپنے دیوی دیوتاؤں کے ساتھ یہ کچھ کرے۔ وہ عام انسانوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کرے گی۔ ظاہر ہے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد، ہم جوڑیاں کے اجڑے ہوئے قصبہ کو دیکھنے گئے۔ قصبہ چھوٹا سا تھا۔ لیکن برباد شدہ عمارات کے کھنڈرات بتا رہے تھے کہ یہاں کے رہنے والے اچھے خوشحال ہوں گے۔ لیکن کھیم کرن کی طرح یہ قصبہ بھی وجعلنھم احادیث کا عبرت انگیز مرقع تھا۔ یعنی ان بستیوں کی اب صرف داستانیں باقی رہ گئی تھیں۔ دور سے سڑک کے کنارے وہ مسجد (یہ وہی مسجد تھی جس کے متعلق ہندوستان نے شور مچایا تھا کہ پاکستانی افواج نے صبح آٹھ بجے بمباری کی اور مسجد میں نمازیوں کو ہلاک کر دیا۔ اول تو آٹھ بجے دن کے کوئی نماز ہی مسجد میں نہیں ہوتی اور پھر اس مسجد میں تو موچی بیٹھتا اور جوتے گانٹھا کرتا تھا۔) دکھائی دی جس کی بابت اخبارات میں اکثر پڑھا تھا۔ بتایا گیا۔۔۔ کہ یہ بڑی خستہ حالت میں پائی گئی تھی اور اس میں ایک موچی بیٹھتا تھا۔ اب ہمارے مجاہدین کے حسن عقیدت اور جوش عمل نے اسے بڑی پاکیزہ عمارت میں تبدیل کر دیا ہے۔

اس مقام سے آگے قریب چار میل تک ہمارا قبضہ ہے لیکن فائر بندی کے سلسلہ میں ہندو جس انداز سے معاہدہ کا "احترام" کر رہا ہے اس کے پیش نظر۔۔ اب سیاحوں کو آگے نہیں جانے دیا جاتا۔ ہمارے زیر قبضہ علاقہ سے آگے قریب تین میل سامنے اکھنور کا مشہور قصبہ ہے۔ یہاں ہم نے اپنے جاں فروش سپاہیوں سے اکھنور کے معرکہ کے تفصیلی حالات سنے۔ انہیں اکھنور سے ادھر رک جانے کا اس (یہ رک جانا اس لئے تھا کہ لاہور کی حفاظت کا تقاضا تھا کہ وہاں کی فوجوں کو فی الفور اس طرف منتقل کر دیا جائے۔ اگر یہ فوری ضرورت لاحق نہ ہوتی تو اس وقت نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ لاہور کی حفاظت کے لئے ہمیں کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ہمیں امید ہے کہ موقعہ آنے پر اہل لاہور اس قرض کو بہ حسن و خوبی ادا کر دیں گے۔ یہ احسان فراموش نہیں ہیں۔) قدر محسوس تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس کا ذکر آتے ہی وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے۔ لیکن جس بے تابانہ نظر سے وہ اکھنور کی سمت دیکھتے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک بندھے ہوئے شیر کی طرح اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ فائر بندی کی آئینی زنجیر کھول دی جائے تو یہ جموں سے ورے دم ہی نہ لیں۔ وہ یہ سننے کے لئے مضطرب و بیتاب نظر آتے تھے کہ فائر بندی کے احکام کب واپس لئے جائیں گے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔۔ سینہ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا۔

دن ڈھل رہا تھا اس لئے ہمیں واپس آنا پڑا۔ اگرچہ جی نہیں چاہتا تھا۔ واپسی اس راستے سے ہوئی۔ جو سیدھا چھمب تک جا پہنچتا ہے۔ صاف' سیدھا' ہموار راستہ۔۔۔ نہ کہیں ٹیلے نہ پتھر۔ نہ ندی نالے نہ سرکنڈا۔ سارا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب۔ وادیٔ کشمیر میں جو کچھ نورجہاں کے دست حنائی اور جہانگیر کے ذوق رعنائی نے کیا ہے اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے تو شادابی اور دلکشی میں یہ علاقہ اس سے کم نہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے اس سے بھی زیادہ جاذب کہ یہاں ہر طرف آموں کے پیڑ ہیں۔ جو وادی

میں نہیں ملتے۔ آم تو اس سارے علاقہ میں بڑی افراط سے پھیلا ہوا ہے۔ راستے میں کھوڑ اور پلاں والا کی بھارتیوں کی تباہ شدہ چھاؤنیاں دیکھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اٹھارہ سال سے مسلسل جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس حسین و شاداب علاقہ کی لطف اندوزی سے ابھی دامن نگاہ پر بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ ہم دریائے توی پار کر گئے۔ چھمب کے تھانے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہاں ذرا رکئے اور دو اہم نکات پر نگہ بازگشت ڈالئے۔

ایک تو یہ کہ اس سیدھے راستے سے ہماری فوجیں گھنٹہ بھر میں جوڑیاں تک پہنچ سکتیں تھیں۔ انہوں نے اس راستے کو چھوڑ کر وہ راستہ کیوں اختیار کیا جس کی دشوار گزاریاں اس قدر ہمت طلب اور حوصلہ شکن تھیں۔ یہ اس لئے کہ اس طرف سے آتے ہوئے اس بین الاقوامی حد فاصل (باؤنڈری لائن) کو توڑنا پڑتا تھا۔ جسے قائم رکھنے کا پاکستان عہد کر چکا تھا۔ دوسری طرف آزاد کشمیر کا علاقہ تھا جس میں اس قسم کی کوئی پابندی ہم پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ آزاد کشمیر کی افواج ادھر سے بڑھ رہی تھیں اور ہم ان کی مدد کے لئے پہنچے تھے۔ اس سے آپ اندازہ لگایئے کہ پاکستان بین الاقوامی معاہدات کا احترام کس طرح کرتا ہے۔ وہ ہمارے علاقے کے اندر اعوان شریف کے گاؤں پر بمباری کر چکا تھا۔ اب کون سا امر مانع تھا کہ ہماری افواج سیدھی ان کے علاقہ میں نہ چلی جاتیں لیکن ہم نے اس پر بھی ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی طرف سے معاہدات کے سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

اور دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس محاذ پر ہماری فوجوں نے جو محیر العقول کارنامے کر کے دکھائے اس کی مثال بھی تاریخ میں شاید ہی کہیں اور ملے۔ چھمب سے لیکر جوڑیاں تک ہم نے ہر مقام پر دیکھا کہ دشمن کے مورچے پہاڑیوں اور بلند ٹیلوں پر تھے اور ہماری فوجیں نشیب کی طرف سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ جو شخص فنون جنگ سے کچھ بھی واقف نہ ہو۔ وہ بھی باسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان حالات میں

مقابلہ کس قدر مشکل' اور معرکہ کس قدر جرات آزما تھا۔ لیکن ہماری فوجوں کو کسی ایک مقام پر بھی شکست نہیں ہوئی۔ وہ درانہ آگے بڑھتی گئیں اور دشمن بھیڑ بکریوں کی طرح ان سے آگے آگے انتہائی بدحواسی کے عالم میں بھاگتا چلا گیا۔ اکثر مقامات پر اس طرح کہ توپ میں گولہ ڈالا ہوا ہے۔ لیکن اسے توپ داغنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ یا اس کا ہوش نہیں رہا اور وہ اسے ویسے کا ویسا چھوڑ کر بھاگ اٹھا۔ دیوا کا پہاڑی مورچہ' منڈیالہ کراسنگ کا حصن حصین' کلیت کا سربفلک قلعہ ٹرونی کی پہاڑیوں کے تین تین منزلہ پختہ مورچے۔ سب دھرے کے دھرے رہ گئے اور ایک بار پھر وہ معرکہ کہن تازہ ہو گیا۔ جس کے ضمن میں قرآن نے کہا تھا کہ **قذف فی قلوبھم الرعب** (اس نے دشمن کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا) جو گروہ موت کے ڈر سے بے خوف ہو کر آگے بڑھے گا اس کی ہیبت سے پہاڑوں کے دل دہل جائیں گے۔ اسی کا مظاہرہ اس محاذ پر ہوا اور یہ سب کچھ تین چار دن کے اندر ہو گیا۔ حالانکہ ایسا طویل اور فرہاد طلب راستہ اتنے عرصہ میں بحالت اطمینان بھی بمشکل پیدل طے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس محاذ کو دیکھ کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ہر چند ساز و یراق اور شمشیر و سنان بھی جنگ کے لئے لابدی ہے۔ لیکن فیصلہ کن ہاتھ ان انسانوں ہی کا ہوتا ہے جو اس سامان اور اسلحہ کو استعمال کرتے ہیں اور ہمارے ہاں وہ انسان (فوجی سپاہی) موجود ہیں۔ جن کا مقابلہ شاید ہی دنیا کا کوئی اور سپاہی کر سکے۔ پاکستانی افواج کے شیر دل مجاہدو! قوم کو آپ پر بجا طور پر ناز ہے۔ تم زندہ و سلامت ہو تو پاکستان ہر خطرہ سے محفوظ و مامون ہے۔ اللہ تمہیں زندہ و سلامت رکھے۔ تم جہاں بھی ہو۔۔۔ دس کروڑ انسانوں کی حسین تمنائیں اور تابندہ آرزوئیں تمہارے ہمرکاب ہیں!

دیدۂ بینائے قوم علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ۔۔۔

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"

ان محاذوں کو دیکھ کر یہ دعویٰ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ

یہ "نم" قرآنی اقدار کے پاک اور صاف زندگی بخش چشمہ کے سوا اور کہاں سے مل سکتا ہے۔ خدا ہمیں اس چشمہ حیات سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہونے کی سعادت نصیب کرے۔

والسلام

قرآن اور قوت کا استعمال

یہ تغلب نہ صرف یہ کہ ناجائز نہیں بلکہ انسانیت کی حفاظت کے لئے ضروری بھی ہے اور یہی ہے وہ تغلب جس کی قرآن کریم نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ عندالضرورت اس کی تاکید بھی کی ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک انسانی جان کی قیمت کتنی بڑی ہے' اس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ **من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض۔ فکانما قتل الناس جمیعا** (5:32)۔ "یاد رکھو! جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق ہلاک کر دیا (یعنی بجز اس کے کہ اسے جرم قتل کی سزا کے لئے ہلاک کیا جائے یا فساد کو روکنے کی خاطر) تو یوں سمجھئے گویا اس نے پوری نوع انسان کو ہلاک کر دیا۔" **ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا** (5:32)۔ "اور جس نے کسی ایک کی جان کو بھی ہلاکت سے بچا لیا تو یوں سمجھئے گویا اس نے تمام نوع انسان کو زندگی عطا کر دی"۔ ایک طرف تو اس کے نزدیک انسانی زندگی کی یہ قدر و قیمت ہے' لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کوئی سرکش اور مستبد انسان' یا انسانوں کا گروہ' مظلوم اور کمزور انسانوں پر گوشہ عافیت تنگ کر دے اور ان کی ہلاکت و تباہی پر اتر آئے تو اسے اس ظلم و استبداد سے روکنے کے لئے پہلے سمجھانا چاہئے اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو قوت کے زور سے اسے اس دراز دستی سے روک دینا چاہئے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی جنگ کو "قتال فی سبیل اللہ" (یعنی نوع انسان کی حفاظت کے لئے اللہ کی راہ میں جنگ) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے کہ **ولو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض۔ ولکن اللہ ذو فضل علی العلمین** (2:251)۔ "اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے (یعنی اس کی اجازت نہ دے) کہ ظلم و ستم کرنے والے افراد کی روک تھام' انصاف پرور گروہ' قوت کے زور سے کریں' تو کرۂ ارض پر فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ لیکن خدا نوع انسان کو اپنے سایہ عاطفت میں رکھنا چاہتا ہے اس لئے اس نے عدل پرور انسانوں کو تاکید کر

رکھی ہے کہ وہ ایسے مقام پر پوری پوری قوت سے کام لیں اور ظالموں کے ظلم کو روک دیں"۔ اس نے جماعت مومنین کو' جہاں پہلی بار جنگ کی اجازت دی ہے' تو وہ بھی ایسا ہی موقعہ تھا اور اس میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ **ولو لا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع و صلوة و مسجد يذكر فيها اسم الله كثيرا۔ ولينصرن الله من ينصره - ان الله لقوى عزيز** (22:40)۔ "اگر خدا ایسا انتظام نہ کرتا کہ انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے جور و ستم کی روک تھام کر سکے تو دنیا سے مذہبی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا اور یہود و نصاریٰ کی خانقاہیں اور یہودیوں کی پرستش گاہیں اور مسلمانوں کی مساجد سب منہدم ہو جاتیں۔ لیکن خدا نے ایسی جماعت (امت مسلمہ) اٹھا کھڑی کی ہے جو اس قسم کے سرکش گروہوں کی روک تھام کا انتظام کرے گی اور چونکہ ان کا یہ عمل خدا کے متعین کردہ پروگرام کی خاطر ہو گا اس لئے خدا بھی ان کی مدد کرے گا۔ وہ بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے"۔

اسی سلسلہ میں اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جماعت مومنین کا فریضہ ہے کہ کوئی مظلوم اسے کہیں سے بھی مدد کے لئے پکاریں وہ اس کی مدد کو پہنچیں۔ ظالم کے تیروں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ اپنی جانیں دے دیں تاکہ ان مظلوموں' کمزوروں اور ناتوانوں کی جانیں بچ جائیں (4:75) اس قسم کی جنگ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوں گی اور سطحی نگاہ سے دیکھنے والے اسے ان کی باہمی جنگ قرار دیں گے۔ لیکن قرآن کریم نے ایک گروہ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی یہ جنگ **"قتال فی سبیل اللہ"** ہے اور دوسرے گروہ کی جنگ **"قتال فی سبیل الطاغوت"** (4:76)- اسی کو (Erich Fromm) نے (Benign Aggression) اور (Malignant Aggression) کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔

(ماخوذ از مطالب الفرقان' جلد دوم' صفحہ 81)